ترنم ریاض کے ناولوں میں نسائی کردار: ایک تجزیاتی مطالعہ

اکیسویں صدی کا نسائی ادب جدید دنیا کے سماجی اور معاشی پہلوؤں کی ان کڑیوں کی نشاندہی کرتا ہے جہاں ہم اپنی سوچ سے بھی زیادہ آگے نکل چکے ہیں۔ سمارٹ ورلڈ کی اس دنیا میں ایک بٹن دباتے ہی ہماری خواہشات اور ضروریات کی ڈھیر لگ جاتی ہے۔ گوگل اور کروم ہمارے ایسے ساتھی ہیں جو ہمارے خون کے رشتوں سے بھی زیادہ اہم بن چکے ہیں، اس کے ساتھ ہی وہاٹس اپ اور فیس بک میں محو ہو کر ہم اپنی سماجی ذمہ داریوں سے آشنا ہوتے ہیں۔

۱۹۸۰ء کے IT ریولیوشن کے بعد یہ تبدیلی ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ لوگوں کے رہن سہن، آپسی تعلقات اور سماجی سلوک میں یکسر طور پر تبدیلی آنے لگی۔ خاص طور پر بیسویں صدی کے آخر سے اور اکیسویں صدی کے آغاز سے نمایاں طور پر تکنالوجی زندگی کے ہر گوشے پر اپنا قبضہ نظر آتا ہے۔

اکیسویں صدی میں دنیا ایک Globalvillge کے نام سے جانا جا رہا ہے یہ دراصل ہماری تہذیب کا عکاس ہے اور جہاں تک اس سے اردو ادب کا رشتہ ہے، اردو ادب سماجی زندگی کی ایک ایسی تصویر ہے جس میں انسانی جذبات واحساسات کے علاوہ مشاہدات،

تجربات اور خیالات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا عصری ادب مختلف مسائل میں خود کو اجاگر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ادیب عام انسان سے منفرد نہیں ہوتا وہ بھی اسی نظام کا پروردہ ہوتا ہے۔ اردو ادب میں بھی ادیبوں نے عصر حاضر کے مسائل کو بہت خوبصورتی کے ساتھ سمیٹا ہے اور اسے ناولوں اور افسانوں کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

آج جس صدی میں ہم جی رہے ہیں وہ ہر وقت، ہر لمحہ، ہر پل ایک قدم آگے کی سوچ رکھتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلیاں اتنی تیزی سے ہو رہی ہیں کہ ہم نے ذرا بھی کوتاہی برتی تو بہت کچھ کھو سکتے ہیں۔ ہماری نئی زندگی ہم سے ہر وقت حرکت میں رہنے کا مطالبہ کرتی ہے۔

عورت جو کہ سماج کا ایک اہم حصہ ہے جس کے بنا زندگی کا وجود ہی ممکن نہیں اسے ہم کیسے فراموش کر سکتے ہیں۔ بہتر انسانی زندگی کے حصول کے لیے خالق نے کائنات میں ان گنت خوشنما رنگ افشاں کیے ہیں مگر انسان نے اس قوس قزح کو ہمیشہ بدرنگ کرنے کیکوشش کی ہے۔ عورت کی داستان بھی اردو ادب میں یا زندگی میں کچھ ایسی ہی رہی ہے۔ رحم سے لحد تک کا یہ سفر۔ شکست وریخت سے دوچار ہوتی ہوئی اس کی روح۔ پھول مل گئے تو مل گئے ورنہ کانٹے تو کبھی مرجھاتے نہیں اور کانٹوں میں الجھی اس کی نفس نفس۔

اردو میں خواتین نے مردوں کے بعد ناول لکھنا شروع کیا۔ بیسویں صدی کے اوائل تک ہندوستانی سماج میں شعر وادب پر صرف مردوں کی اجارہ داری تھی خواتین کے لیے اس کوچے میں قدم رکھنا مذہبی اور معاشرتی رسوائی کا باعث تھا۔۔ خواتین میں ناول نگاری کی ابتدا انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ہوئی۔ بیسویں صدی کی پہلی دو دہائی میں خواتین کے تحریر کردہ متعدد ناول منظر عام پر آ چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تعلیم کے فقدان کی بنا پر جہالت کی ساری لڑائیاں مسلم معاشرہ کا حصہ تھیں۔ تعلیم خواتین کے لیے ضروری نہ تھی اور نہ ہی معاشرے کو ان کی کسی ذہنی اور روحانی ضرورتوں کا احساس تھا۔ زندگی کی تین بنیادی

ضرورتیں، کھانا، کپڑا، اور مکان ان کا حق تھا۔ اس سے زیادہ کی نہ وہ حقدار سمجھی جاتی تھیں اور نہ وہ اس سے زیادہ کا مطالبہ کرتی تھیں۔

رفتہ رفتہ اس منجمد معاشرے میں تبدیلیاں آنی شروع ہوئیں۔ بے حسی کی گبرف پگھلنے لگی۔ سیاسی تحریکوں اور نئی تعلیم کے اثر سے پورے نظام زندگی کا ڈھانچہ بدلنے لگا۔ معاشرتی زندگی میں تبدیلی لانے اور سیاسی وسماجی مقاصد کے حصول کے لیے ادب کو بطور آلہ کار استعمال کرنے کا رجحان عام ہوا۔ نذیر احمد اور راشدالخیری نے شروعاتی دور میں ناول لکھے اور اس کے ساتھ ہی بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں تعلیم یافتہ خواتین کا ایک ایسا طبقہ ابھر کر سامنے آیا جس نے خواتین پر ہونے والے ظلم اور بے انصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔

ان ناولوں میں جو عورت ہمیں نظر آتی ہے وہ نذیر احمد اور راشدالخیری کے ناولوں کی عورتوں کی طرح گھر کی چہادر دیواریوں میں بند نہیں ہیں بلکہ آزادانہ طور پر اپنے حقوق اور اپنی زندگی کے لیے نئی راہیں ہموار کر رہی ہیں۔ مثال کے طور پر مکان کی نیرا، نیلام گھر کی نیلوا ور مس بھٹناگر، کینچلی کی مینا، خوابوں کا سویرا کی کلثوم، پتن ہی کے راما کی سکوبانی، فائر ایریا کی پھل منی، ختونیا، اور کلیامہتائن فرات کی شبل اور مورتی کی ملیحہ۔

یہ ملیحہ ترنم ریاض کے ناول کی کردار ہے جس پر آگے تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

ترنم ریاض ان جدید افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں ہیں جن کی کہانیاں عصر حاضر کی تہذیب وثقافت کے حوالے سے عورتوں کی نفسیاتی جذبات کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی تہذیب وتمدن کے پس منظر میں عورتوں کے تمام مسائل کو اپنی کہانیوں میں کواجاگر کیا۔ ان کی کہانیاں ایک طرف کشمیری عوام کی زندگی کا عملی نمونہ پیش کرتی ہیں تو دوسری طرف ایسی فضا قائم کرتی ہیں کہ کشمیر کی خوبصورتی اور اس کا حسین منظر ہمارے آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتا ہے، اور قاری کشمیر کی حسین وادیوں میں کھو جاتا

ہے۔ان کی کہانیوں کے موضوعات عام لوگوں کی زندگی سے قریب تر ہوتے ہیں اور قاری کو ان کرداروں اور آس پاس کی فضا سے وابستگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

یہ کہانیاں ماحول کے پیش نظر اخلاق و اقدار سے پر نظر آتی ہیں۔ ناول نگار جیسا سماج میں دیکھتی ہیں اس کو اپنی کہانیوں میں تحریر کر دیتی ہیں۔ان کی کہانیاں بناوٹ اور تصنع سے پاک حقیقت کا پیکر نظر آتی ہیں۔ ریاض صاحبہ ایک ایسی فنکارہ ہیں جن میں انسانیت اور حساسیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور انہوں نے اپنی حساسیت برقرار رکھتے ہوئے حقیقی پیرائے میں عام زندگی کی پیچیدگیوں کو موضوعات کا نیا جامہ پہنایا ہے۔

ترنم ریاض کی کئی تخلیقات منظر عام پر آ چکی ہیں لیکن خاص طور پر ان کا ناول ''مورتی'' میرے ذہن کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے اور مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں اس نئے زمانے کی عورت کی ذہنی پیچیدگیوں کو ایک عام عورت کی زندگی کے پیرائے میں تجزیہ کر سکوں۔اس ناول میں عورت کا اہم کردار نبھانے والی، خاتون ملک کی راجدھانی دلی شہر کی ایک تعلیم یافتہ خاتون ہے جو کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد پیدا ہوئی۔ یہ عورت صرف تعلیم یافتہ ہی نہیں بلکہ ایک حساس فنکارہ بھی ہے،لیکن اپنی تمام تر قابلیت کے باوجود وہ پدرشاہی نظام کے استحصال کا شکار نظر آتی ہے۔

اس عورت کا کردار ایسی بہت سی عورتوں کی زندگیوں کی عکاسی کرتا ہے جو اپنی ازدواجی زندگی میں اپنے شوہر کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے خود سے بیزار ہیں اور سماجی بندشوں کی وجہ سے اس زندگی سے چاہ کر بھی نکل نہیں پاتیں۔اس زمرے میں زیادہ تر وہ خواتین آتی ہیں جو انفرادی سوچ کے متحمل ہیں۔لہذا سب سے زیادہ یہی خواتین ،ذہنی تناؤ کا شکار نظر آتی ہیں اور بسا اوقات حالات سے مجبور ہو کر اپنی زندگی کو اپنے ہی ہاتھوں ختم کر دیتی ہیں۔

لیکن اس ناول کی اہم کردار ''ملیحہ'' اتنی بزدل نہیں بلکہ ایک بہادر اور دلیر لڑکی ہے آخر

دم تک اپنے خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اپنے شوہر سے بغاوت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ملیحہ ایک فنکارہ ہے جو اپنی زندگی، اپنی محنت اور اپنے فن کی گہرائی میں ڈوب کر جینا چاہتی ہے۔ وہ شوہر کی محبت اور پیار کا حق پانے میں تو ناکام ہے لیکن اپنے کام میں محو، خود کو بھول کر اپنے مجسموں کو خواب کا جامہ پہنا رہی ہے۔

یہ کہانی ایک نوجوان لڑکے فیصل کی زبانی فلیش بیک میں چلتی ہے۔

کہانی میں ہمیں عہد حاضر کے سماج کا ایک اہم مسئلہ، لڑکیوں کے سلسلے سے، یعنی بے جوڑ شادی کا نظر آتا ہے۔ اور یہ تبھی ہوتا ہے جب ماں باپ اپنے بچوں کی شادی میں ان کے فیصلے کو اہمیت نہ دیتے ہوئے خود کے فیصلے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہاں میں یہ نہیں کہتی کہ ماں باپ ہمیشہ غلط فیصلہ لیتے ہیں بلکہ وہ تو اپنے بچوں کی بھلائی کے لئے سارے قدم اٹھاتے ہیں لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ آج ہم جس سماج میں جی رہے ہیں وہاں لڑکیاں پہلے کی طرح صرف اور صرف گھروں میں قید نہیں ہیں دنیا کو بہتر طور پر سمجھنے کی سوجھ بوجھ رکھتی ہیں اور اپنی زندگی کا فیصلہ لیتے وقت اپنے ہونے والے شوہر سے بھی کئی طرح کی توقعات رکھتی ہیں لہذا ہر حال میں وہ بھی اپنے بہتری کے تئیں بیدار ہیں۔ لہذا شادی بیاہ میں بھی ان کی مرضی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ ان کے والدین کی

لیکن آج بھی بہت سے والدین اپنی بیٹی کی زندگی کے اس اہم فیصلے میں ان کی رائے نہیں لیتے اور صرف یہ دیکھ کر بچوں پر حاوی رہتے ہیں کہ جس گھر میں اس کا رشتہ ہو رہا ہے وہ لوگ مالدار ہیں، زمین جائیداد والے ہیں، اور ان کی لڑکیوں کو اس کے سسرال میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کیا واقعی ان کی لڑکی صرف پیسوں کے سہارے اپنے شوہر کے ساتھ خوش رہ پائے گی؟ حالانکہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی جینے کے لئے پیسے کی بہت اہمیت ہے لیکن صرف پیسے سے ہی سب کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ خوشی پانے کے لئے سب سے ضروری چیز ہے دو انسانوں کی ذہنیت کا میل

یعنی مزاج کا میل، دونوں کی سوچ وسمجھ کا میل۔تبھی جا کر ان کی ازدواجی زندگی بہتر ہوسکتی ہے ورنہ دونوں کی زندگی اندر ہی اندر گھٹتی رہے گی اور وہ بہتر زندگی کی ضروریات کو پورا نہیں کر پائیں گے۔

ملیحہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ایک حساس مزاج کی کردار تھی اور اپنی شناخت اور انفرادیت کی کوشاں تھی۔اسے معلوم تھا کہ ایک فنکار ہونے کی حیثیت سے اسے سماج میں وہ نام وشہرت ملے گی جو کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے مجسموں کے ذریعہ زندہ رہے گی۔یہ اقتباس دیکھیں۔

''عافیہ بی تم دیکھنا میں اپنے مجسموں میں زندہ رہوں گی بھلے ہی کوئی میرا نام نہ جانتا ہو بی سو سال بعد شاید بی میرے فن پارے بھی کسی فن کے پرستار کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائیں گے بی کوئی اسے ہی میرے بارے میں سوچے گا بی جیسے بی جیسے میں'' اس کی کانپتی ہوئی آواز گلوگیر ہوگئی بی عافیہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا بی''(۱)

یہ عظیم فن کارہ جو ہمیشہ اپنے مجسموں میں زندہ رہنا چاہتی تھی اور قیامت تک مرنا نہیں چاہتی تھی، اسے جیتے جی شوہر کی ناقدری نیمارڈالا۔وہ خود ایک جیتی جاگتی مورت بن گئی تھی جسے نہ تو اب اپنی زندگی سے لگاؤ تھا اور نہ ہی اس دنیا کے معاملات سے۔اس کی دنیا اب وہ اندھیری کوٹھری تھی جہاں وہ اپنی خواہشات اور اختیارات کو مجسموں کی شکل دے رہی تھی۔

ملیحہ حسین وجمیل ہی نہیں بلکہ ان تمام خوبیوں کا مجسمہ تھی جو آج کے زمانے میں ہر مرد اپنی ہونے والی بیوی سے تصور کرتا ہے۔ہم اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ ہر شخص مکمل نہیں ہوتا اور ملیحہ کی سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ اسے غصہ بہت جلد آتا تھا اور وہ اسے کسی اور پر اتارنے کے بجائے خود پر اتارتی تھی۔

''ملیحہ دنیا کی سب سے مکمل لڑکی تھی۔میرے خیال سے...''

عافیہ نے کئی دفعہ گھر میں ذکر کیا تھا:

''اکبر علی کو مجسمہ سازی پسند نہ تھی۔

ملیحہ کے مجسمے اس کے تخیل کی جیتی جاگتی مثال تھے۔اس بات کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے ایک بچی اور ایک بوڑھی عورت کا مجسمہ بنایا تھا جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ اپنی زندگی میں ایک بیٹی کی خواہشمند تھی ،لیکن دوسری طرف شوہر کی ناقدری کی وجہ سے جلد سے جلد خود کے بوڑھا ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ملیحہ ان پڑھی لکھی تعلیم یافتہ عورتوں میں تھی جو کہ ۸۰ کی دہائی کے آس پاس نظر آتی ہیں اور اس وقت جبکہ ہمارے سماج میں پڑھی لکھی عورتوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی ،وہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کر رہی تھی اور ساتھ ہی اس کے فن کی نمائش للت کلا اکادمی جیسے عظیم ادارے میں ہو رہی تھی۔'

ملیحہ کی مجسمہ سازی اکبر علی کے لئے توڑ پھوڑ سے زیادہ نہیں تھی اور یہی وجہ تھی کہ ایک عظیم فنکارہ اندر ہی اندر ٹوٹ رہی تھی۔ملیحہ اور اکبر علی کی ازدواجی زندگی ایک رسمی رشتے سے زیادہ اور کچھ نہیں تھی۔ان دونوں میں نہ تو شوہر و بیوی کی محبت دکھائی دیتی تھی اور نہ ہی دونوں میں کسی طرح کی کی ذہنی مطابقت تھی۔خوشی اس کے چہروں سے نہ صرف کوسوں دور تھی بلکہ وہ اپنے شوہر کی موجودگی میں اور زیادہ سنجیدہ نظر آتی تھی۔اکبر علی بھی اس سے صرف ضرورت کی باتیں کرتے تھے،ایک ہی چھت کے سائے میں میاں بیوی کا یہ رشتہ بند کمرے کی تھا جس میں کئی برسوں سے تالا لگا دیا گیا ہو۔آئے دن اسے مجسمہ بناتے وقت چوٹیں لگتیں اور وہ اسے اپنی دنیا میں گم نظرانداز کر دیتی۔

فیصل وہ شخص تھا جو دلی اپنے کام سے آیا تھا لیکن اپنی بھابی اور ملیحہ کی سہیلی عافیہ کے کہنے پر اس سے ملنے جاتا ہے اور اس کی خوبصورتی اور فن کو دیکھ کر اس کا دلدادہ ہو جاتا ہے،ساتھ ہی وہ ملیحہ اور اکبر علی کی ازدواجی زندگی کو پڑھ لیتا ہے۔اسے باتوں ہی باتوں

میں اکبرعلی کے مزاج اور ملیحہ کی ذہنی کرختگی کا احساس ہوجا تا ہے اور وہ ملیحہ کا حق دلانے کے لئے دل وجان سے جٹ جا تا ہے۔ملیحہ اور اکبرعلی کے رشتے میں کسے شکست ملتی اور کسے فتح ، یہ ایک مشکل بات تھی۔عورت چاہے جتنا بھی کوشش کر لے جیت اسی مردانہ سماج کی ہوتی ہے۔ملیحہ ایک فنکار تھی یہ بہت خوش نصیبی کی بات تھی لیکن ساتھ میں وہ ایک عورت تھی یہ اس کی بدنصیبی تھی اور وہ اس حاکمانہ سماج کے آگے اپنی زبان کھول نہیں سکتی تھی۔اگر وہ چاہتی تو jnu جیسے تعلیمی ادارے سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اکبرعلی کو اپنی زندگی سے الگ کر کے اپنی زندگی جی سکتی تھی لیکن یہاں اس نے بےبسی کا ثبوت دیا جس سے اکبرعلی جیسے مردوں کی اجارہ داری کو اور زیادہ تقویت ملی۔

اس بےبسی کے پیچھے وجہ جو بھی رہی ہو چاہے سماجی دباؤ نے ہی اس کی ازدواجی زندگی کو خیر باد کہنے کا فیصلہ طے نہ کیا ہو۔اس پوری کہانی میں وہ اخیر تک کہیں بھی شوہر سے الگ ہونے کی بات کرتی نظر نہیں آتی ہے اور وہ ہندوستانی عورت کی طرح تمام ذہنی و جسمانی اذیتوں سے جوجھتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ملیحہ کی ماں بننے کی خواہش قدرتی طور پر پوری نہیں ہوئی تھی لیکن وہ اپنے تخیل کو اپنے فن میں ڈوب کر پورا کر رہی تھی۔اس کے علاوہ یونیورسٹی سے گئے ہوئے کشمیر کے دورے پر اس مجسمے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جو چمک دکھائی دیتی ہے وہ شاید دوبارہ نہ آئی ہو۔یہ مجسمہ کسی شوہر نے اپنی بیوی کی موت کے بعد اس کی یاد میں اس کیصلیب کے اوپر بنوایا تھا۔

وہ ایک طرف شوہر اور بیوی کے مجسمے کو دیکھ کر بے قابو ہوجاتی ہے تو دوسری طرف ایک عظیم فنکار کی حیثیت سے ہمیشہ اپنے مجسموں میں اپنی شناخت تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے اور قیامت تک ان مجسموں اور فن پاروں میں زندہ رہنے کا خواب دیکھتی ہے لیکن قدرت کو شاید یہ منظور نہیں تھا اور اس کے شوہر کی غیر مطابقت نے اسے جیتے جی مار ڈالا۔

ملیحہ کو اکبر علی کے گھر میں زندگی جینے کی تمام آسائشیں موجود تھیں، لیکن دونوں کے مزاج کی غیر ہم آہنگی نے ملیحہ کو پتھروں سے سر پھوڑنے پر مجبور کیا۔ یہ بات ملیحہ سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ اگر کسی لڑکی کا ساتھی اس کا ہمسفر ہم خیال اور ہم مزاج نہ ہو تو زندگی کیسی اجیرن ہو جاتی ہے۔

فیصل کا ملیحہ کی زندگی میں قدم رکھنا اندھیرے میں چراغ جلانے کا کام کرتا ہے۔ وہ ملیحہ یا اس کے فن کو کبھی مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن ملیحہ کے شوہر اکبر علی اسے پاگل قرار دیتے۔

فیصل نے ملیحہ کے مجسموں کی نمائش کے لئے ترویج کلا سنگم میں گذارش ڈالی اور وہ منظور بھی ہو گئی لیکن اکبر علی ملیحہ کے اسٹوڈیو کو اپنے آفس میں تبدیل کرنے کے لئے مزدوروں سے کام شروع کروا دیا اور انہوں نے ملیحہ کے انمول نایاب مجسموں کو حفاظت سے رکھنے یا اٹھانے کی کوئی تاکید بھی نہیں کی، نتیجتاً مجسمے اپنی اصل شکل میں باقی نہیں تھے اور جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے تھے۔ ملیحہ یہ دیکھ کر بے سود ہو گئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی

یہاں ملیحہ کا ذہنی ہمسفر اور ہم خیال فیصل جسے ملیحہ اور اس کے فن، دونوں پر ناز تھا ملیحہ کی حالت پر زار و قطار آنسو بہا رہا تھا اور خود کو اس دنیا کا بے بس انسان محسوس کر رہا تھا لیکن یہاں ایک فن کارہ کی زندگی جو خدا کا تحفہ ہے لیکن اس سماج کے کچھ مرد اس تحفے کی خوشی کو بھی برداشت نہیں کرنا چاہتے، انھیں تو صرف ایک ایسی لڑکی چاہیے جو بس دن رات ان کے حکم کی پیروی کریں اور ہمیشہ ہنستی رہیں، اپنے دکھوں کا بکھان کسی سے نہ کریں یہاں تک کہ وہ اپنے دکھوں سے بھی شوہر کی زندگی میں کوئی خلل نہ پیدا کریں۔ لیکن جب شوہر پریشان اور آسودہ ہو تو اس کی ہمت افزائی کرے، خود بھی اسکے غم میں ساتھ دے۔

شوہر اور بیوی کا رشتہ ایک مضبوط سماج کی نمائندگی کرتا ہے جہاں زندگی متوازن ہونی چاہیے نہ کہ کوئی ایک دوسرے پر ہر وقت برتری حاصل کرنے کی کوشش۔ لہٰذا یہاں

ملیحہ کے ساتھ بھی وہی ہوا جس کی شکار آج بھی بہت سی لڑکیاں اور خواتین ہیں۔

عورت ہر زمانے میں مختلف مسئلوں اور مباحث کا شکار رہی ہے۔ رحم سے لحد تک کا یہ سفر اسے کئی معنوں میں نئے نئے تجربوں سے ہمکنار کراتا ہے اور زندگی سے لڑنے اور جوجھنے کا نیا راستہ دکھاتا ہے۔ اور وہ ان تمام تجربوں کو اپنے اندر سجوئے رکھتی ہے اور اپنی مستقبل کی تصویر کو پہلے سے زیادہ مضبوط بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی ہے لیکن کہیں نہ کہیں ہمارا سماج اسے ہر راہ پر کمزور ثابت کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ عمر کا ہر دور میں انہیں نئے مسائل سے دوچار کراتا ہے، اگر ایک طرف والدین کی دی ہوئی زندگی مختلف ہدایتوں اور نصیحتوں کا سر چشمہ ہوتی ہیں تو دوسر طرف ازدواجی زندگی میں اپنے شوہر اور سسرال والوں کی خوشی اور ناخوشی کے سامنے اسے اپنی خواہشات کا گلا گھونٹتی رہتی ہیں۔ خدا کی دی ہوئی یہ زندگی عورت کے لئے ہر موڑ پر قربانی ہی چاہتی ہے، اپنے جائز خواہشات، اپنے جذبات کو عورت بعض دفعہ ظاہر ہی نہیں کرتی بلکہ سینے میں دفن کر لیتی ہے۔

سماج میں عورت کی جو حیثیت نظر آتی ہے، ہمارے مذہب میں معاملہ برعکس نظر آتا ہے، اسلام میں عورت کا درجہ وہی ہے جو ایک مرد کو حاصل ہے۔ زندگی کا نظام چلانے میں دونوں برابر کے شریک ہیں، نکاح کی صورت میں مرد اور عورت کے درمیان جو رشتہ قائم ہوتا ہے اس کی حیثیت اسلام میں حقوق اور ذمہ داریوں کا دوطرفہ معاہدہ ہوتا ہے جہاں عورت اور مرد ساری زندگی خود کو ایسے رشتے میں جوڑتے ہیں جو انہیں ایک دوسرے کا رفیق اور خیر خواہ بناتا ہے اور اس طرح زندگی کے ہر سفر میں چاہے وہ سنجیدہ ہو یا خوشگوار دونوں ایک ساتھ مل کر طے کرتے ہیں۔

اسلام میں مرد اور عورت ایک دوسرے کا ضد نہیں بلکہ ایک دوسرے کا تکملہ ہیں اور دونوں میں حیاتیاتی فرق پائے جاتے ہیں اور اسی بنا پر دونوں ایک دوسرے کی کمی پورا کر کے دنیا کا نظام چلانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان دونوں پر ایک دوسرے کا

حق اس بات کی طرف نشاندہی کرتا ہے کہ مرد یا عورت خود ایک دوسرے کے نزدیک احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں، بلکہ پیار محبت اور حق کے ساتھ اپنے خواہشات کو تکمیل دیں۔ مصنفہ نے عورت کی ازدواجی زندگی اور شوہر کی اس کے تئیں بے راہ روی کو موضوع بنایا ہے کہ کس طرح ہمارا یہ سماج بیویوں کو کمتر سمجھتا ہے اور اس کی جائز خواہشات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے اس کی انفرادیت کو ہر لمحہ کریدتا رہتا ہے۔

محمدی بیگم جن کا تعلق ناول کی دنیا میں انیسویں صدی کا ہے انہوں نے بھی اپنے ناول 'صفیہ بیگم' میں اس طرح کی شادی کے خلاف آواز اٹھائی ہے، جہاں بچیوں کی شادی میں ان کی رضامندی شامل نہیں کی جاتی۔ اس ناول میں صفیہ کا کردار ہے جو کہ تعلیم یافتہ ہے لیکن بچپن میں ہی اس کی مرضی کے خلاف اس کی منگنی کر دی جاتی ہے۔

محمدی بیگم نے اس ناول کے ذریعہ معاشرہ میں عورتوں کے مقام، ان پر ہونے والے ظلم وستم، زیادتی اور جبر وتشدد کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کیا ہے۔ مردوں کے ہاتھ میں عورت کھلونے کے طور پر تھیں۔ مردوں نے اپنی مرضی کے مطابق عورتوں کا استعمال کیا۔ اور اس بنا پر صفیہ بھی سماج کے پروردہ لوگوں کے ہاتھوں سامان کے طور پر ادھر سے ادھر ہوتی ہے۔ محمدی بیگم کے ناول میں صفیہ کی یہ شبیہ صرف صفیہ کی نہیں تھی بلکہ ہزاروں لڑکیوں کی تھی۔

صفیہ کا وصیت نامہ جو ایک خط کی صورت میں ملتا ہے سارے قصے کا ماحصل ہے اور اکیلی صفیہ کی جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ اس دور کی بیشمار معصوم اور بے بس یتیموں کی دبی دبی آہوں اور سسکیوں کی غمازی بھی کرتا ہے۔ وصیت کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جسے پڑھنے سے اس دور میں عورتوں کی زندگی کا عکس ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

"درودیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

> اے بزرگو، میری آخری التجا ہے کہ تم اولاد کی شادی میں جان توڑ کر چھان بین کرو۔ یہ چھان بین جس طرح ذات اور نسب کی جاتی ہے اسی طرح ان کی صحت جسمانی کی، عادات کی، چال چلن کی، مزاج کی، کیفیت کی، اخلاق کی اور سب سے زیادہ لڑکی کی رضامندی کی جائے۔"
> (۱۸)

لہذا ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ترنم ریاض کے ناول کا موضوع آج بھی اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے جو کہ کئی زمانے سے چلا آرہا ہے۔ ترنم ریاض نے موجودہ عہد میں پڑھی لکھی لڑکیوں کی بے جوڑ شادی کا مسئلہ ایک عظیم فن کارہ کی زندگی کے پس منظر میں دکھایا ہے۔ وہ خود بھی عظیم فن کارہ ہیں اور ان کی حساس طبیعت ان کی کہانیوں میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے عہد حاضر کے سماج میں عورتوں پر ہورہے ذہنی دباؤ کی تصویر پیش کی ہے جس سے یہ ناول عورتوں سے بہت قریب نظر آتا ہے۔

Ekkisven Sadi ka Nesai Adab
(Bainaul Aqwami Seminar ke Maqalae)
ISBN:978-81-954754-7-6
Compiled By
Prof. Khwaja Md. Ekramuddin
Edition 2021

نام کتاب : اکیسویں صدی کا نسائی ادب (بین الاقوامی سیمنار کے مقالے)
ترتیب وتدوین : پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
ایڈیشن : 2022
صفحات : 430
قیمت : 500روپے
قیمت ای بک : 200روپے
ناشر : ورلڈ اردو پبلی کیشن اینڈ ریسرچ سینٹر
زیر اہتمام :

ورلڈ اردو ایسوسی ایشن، نئی دہلی
WORLD URDU ASSOCIATION
F. 11/43 T/F, Jogabai Extn. Okhla, New Delhi. 110025 (INDIA)
www.worldurduassociation.com, Mob+91 9654748142

Published by
CREATIVE STAR PUBLICATIONS
Printer, Publisher & Distributors
F-11, Usman Complex, Jogabai Extn, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Mob: 8851148278, 9958380431, Ph: 011-26980431
www.creativestarpublication.com

اکیسویں صدی کا نسائی ادب

(آن لائن سیمینار کے مقالے)

ترتیب و تدوین

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

ورلڈ اردو ایسوسی ایشن نئی دہلی (انڈیا)